الطاف احمد اعظمی

اسلام اور جمہوریت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس
میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

(۲)

یہ بات بھی میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کو بادشاہ سے کوئی کد نہیں۔ بادشاہ کو عادل ہونا چاہیے، شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔ خلیفہ ہے تو وہ اللہ کے قانون کو، شریعت کو جاری کرنے والا ہو اور شوریٰ کا پابند ہو۔ شوریٰ کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے قانون کے تابع ہو اور اجتہاد پر مبنی ہو۔ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ اہل علم، اہل استنباط اور اہل الرائے اس کے ممبر ہوں[۲۷]۔''

راقم کا خیال ہے کہ جمہوریت کے بارے میں اوّل الذکر گروہ غلطی پر ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت بطور ایک سیاسی نظام کے عین اسلام ہے وہ جمہوریت کے فلسفہ اور اس کی تاریخ سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ جمہوریت میں آمریت کے برخلاف حکمران کا انتخاب ہوتا ہے اور اس میں خاص و عام سب شریک ہوتے ہیں اور ہر شخص کو آزادیِ فکر و عمل حاصل ہے، گمان کر لیا کہ یہ عین اسلامی طرز حکومت ہے۔

لیکن یہ محض جزئی مشابہت ہے۔ یہ اسی طرح کی مشابہت ہے جو اسلام کے نظریۂ معیشت اور سوشلزم میں ہے کہ دونوں ہی نظام ارتکازِ زر کے خلاف ہیں۔ اس جزئی مشابہت کو دیکھ کر بعض اہلِ علم نے خیال کیا کہ اسلام سوشلزم

---

[۲۷] تدبّر، لاہور پاکستان، ماہ جون ۲۰۰۴ء ص ۴۹

کا حامی ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کر لی۔ جس طرح یہ بات غلط ہے، اسی طرح پہلی بات بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ایک اپنا منفرد سیاسی نظام ہے جو مشاورت کے اصول پر مبنی ہے۔[28] یہ شورائی نظام تمام مادّی نظامات سے بالکل الگ ہے۔ وہ ایک خدا پرستانہ نظام ہے جس میں خدا کی حاکمیت کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں مادّہ اور روح دونوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کے امور عقل اور وحی دونوں کی رہ نمائی میں انجام دیے جاتے ہیں، جب کہ جمہوریت کے سیاسی فلسفہ میں روحانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، وہ ایک خالص مادّہ پرستانہ سیاسی نظام ہے اور اس میں عوام ہی حاکم اور قانون ساز ہوتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

جمہوریت کا جائزہ، اسلامی نقطۂ نظر سے

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ دوسرے عصری مادّی نظامات کے مقابلے میں جمہوریت اپنے متعدد نقائص کے باوجود قابلِ ترجیح ہے اور اہل دنیا کے لیے ایک مفید سیاسی نظام ہے۔ لیکن اہلِ اسلام کے لیے جمہوریت میں کشش کا کوئی سامان نہیں ہے، اور کیوں کر اس طرف ان کا میلان ہو سکتا ہے کہ وہ مادّی طرز فکر کی ترجمان ہے۔ یہ اس لیے بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام ہر پہلو سے جمہوریت سے فائق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں جمہوریت کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے لوں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جمہوریت اور اسلام کے بعض اصولوں میں جو مشابہت نظر آتی ہے وہ بالکل ظاہری مشابہت ہے، فی الواقع ان میں مغائرت ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو کہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں میں جو نقائص ہیں اور ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، ان سے اسلام کا سیاسی نظام پاک ہے۔

(۱) حاکمیتِ عوام: اسلامی نقطۂ نظر سے جمہوریت کی سب سے بڑی نظری خامی اس کا تصوّرِ حاکمیت ہے، یعنی یہ خیال کہ عوام ہی اصل فرماں روا، حاکم اور قانون ساز ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام میں حاکمیتِ عوام کے بجائے حاکمیتِ الٰہ کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں کسی انسان کو خواہ اس کا تعلق طبقۂ عوام سے ہو یا خواص سے، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حاکم بن کر دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اس میں عوام تو کجا، علماء و مشائخ کو بھی ''ارباب من دون اللّٰہ'' بننے کا حق نہیں دیا گیا ہے۔

حکومت کرنے کا حق صرف اس خدائے ذوالجلال کو حاصل ہے جو انسانوں کا خالق و مالک اور ان کا پروردگار ہے۔ وہی اصلی حاکم ہے اور بقیہ سارے انسان اس کے بندے اور تابعِ فرمان ہیں۔

جن لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی نظام کی باگ ڈور ہوتی ہے ان کی حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ اصلی حاکم کی طرف سے بندوں کے اجتماعی معاملات کے نگراں اور منتظم کی ہے۔ ان کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ خود حاکمِ کائنات کی مرضی کے مطابق چلیں اور بندگانِ خدا کو بھی اس کے احکام وقوانین کے مطابق جو اس کی آخری کتاب میں دیے گئے ہیں، چلائیں اور عدل وانصاف کے ساتھ ان کے معاملات کی دیکھ بھال کریں۔ اسلام میں حکومت ایک امانت ہے اس لیے اس کا حق وہی لوگ ادا کرسکتے ہیں جو امین ہوں۔

انسان کی فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کرے، خواہ یہ غلامی استبدادِ شخصی کی صورت میں ہو یا جمہوریت کے خوش نما لباس میں۔ اسلام کے سیاسی نظام کے سوا کوئی دنیوی نظام ایسا نہیں ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دے سکے۔

(۲) انفرادی آزادی: جمہوریت میں انفرادی آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے، لیکن اس کا مطلب مطلق آزادی نہیں، جیسا کہ جمہوریت کے نادان حامی خیال کرتے ہیں اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مطلق آزادی کا مطلب فکری اور عملی انارکی ہے اور اس سے معاشرے میں فتنہ وفساد پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ ایشیاء اور افریقہ کے جمہوری ملکوں میں اس بے قید آزادی کے اندوہ ناک مظاہر اکثر وبیشتر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں ہندوستان میں دلّی اور ملک کے دوسرے حصوں میں سکّھوں کے ساتھ ہونے والا انسانیت سوز سلوک، ۲۰۰۲ء میں گجرات کے مسلمانوں کا قتلِ عام، اور ابھی حال ہی میں اڑیسہ کے عیسائیوں کی جان ومال کی بربادی اسی بے قید آزادی کے مہلک نتائج ہیں۔

اسلامی نظام میں کسی شخص یا گروہ کو اس نوع کی مطلق آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں آزادی کا مفہوم اور اس کی حدود بالکل واضح ہیں۔ آزادی کا مطلب قوانین کے دائرہ میں رہ کر عمل کی آزادی ہے۔ قانون کی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہی یہ آزادی مسلوب ہو جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں ہر شخص کو خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، مذہب وعقیدہ، تنظیم واجتماع بشرطیکہ اچھے کاموں کے

۲۸؎ اس کو جمہوریت کے بالمقابل ''شورائیت'' کہہ سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ اصطلاح عربی قواعد کے لحاظ سے صحیح ہو۔ اس کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے ''اللہ کی حکومت، اہل الرّائے مومنوں کے ذریعہ، لوگوں کے فائدے کے لیے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیے ہو، نہ کہ شر وفساد پھیلانے کے لیے، اور کسبِ معاش کی پوری آزادی اور یکساں مواقع حاصل ہیں۔ متانت اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر اظہارِ خیال اور اختلافِ رائے کا حق بھی سب کو حاصل ہے۔ اس میں مالک اور نوکر اور مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

عہدِ نبوی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت کو جب اس کے شوہر نے مارا تو اس نے کھلے عام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اپنے شوہر کی شکایت کی (سورۂ مجادلہ: ۱)۔ ایک بار کسی بات پر حضرت عمر کی بیوی نے ان کو پلٹ کر جواب دیا تو انھوں نے کہا، اب تمھارا یہ رتبہ ہو گیا، وہ بولیں کہ تمھاری بیٹی تو رسول اللہ سے دو بدو ایسی باتیں کرتی ہے۔[۲۹]

یہ اظہارِ رائے کی آزادی ہی تھی کہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا: اسمعوا وطیعوا ''سنو اور مانو'' تو ایک شخص نے بے باکی کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا: نہیں، پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ جو لباس پہنے ہوئے ہیں وہ کیسے بنا؟ جب خلیفہ کے فرزند عبداللہ بن عمر نے ان کی طرف سے تسلّی بخش جواب دے دیا تو اس نے کہا، ہاں اب کہو، ہم سنیں گے اور مانیں گے۔[۳۰] اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر تقریر کر رہے تھے کہ ایک شخص کھڑا ہو گیا اور بولا: اتّق اللّٰہ یا عمر ''اے عمر، خدا سے ڈرو۔'' حاضرینِ مجلس کو یہ بات گراں گزری اور ان میں سے ایک شخص نے اس کو خاموش کرنے کی کوشش کی تو خلیفہ نے کہا، اس کو کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں تو ان کا کیا فائدہ اور ہم ان کی نہ سنیں تو ہماری کیا ضرورت۔[۳۱]''

(۳) مساوات: جمہوریت میں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، سب لوگ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، گورے ہوں یا کالے، پیدائش کے اعتبار سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب، جنس اور رنگ و نسل کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی قابلیت اور سعی و جہد سے حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قانون کی نظر میں ہر آدمی مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن مساوات کے یہ سارے جمہوری دعوے محض کاغذی زینت ہیں، عمل کی دنیا میں ان میں سے ایک دعویٰ بھی آج تک حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر جمہوری ملکوں میں سماج کے کمزور طبقات اور اقلیتوں کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ چوں کہ جمہوریت میں اکثریت کی حکومت کا قاعدہ چلتا ہے اس لیے جو طبقہ تعداد میں زیادہ ہوتا ہے وہ سماج کے ان طبقات کے ساتھ جو تعداد میں کم ہوتے ہیں، ناروا سلوک کرتا ہے، ان کو خود سے حقیر اور کم تر سمجھ کر ان کے خلاف ہر طرح کی زیادتی کو جائز سمجھتا ہے۔ ان کی جان و مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اتنا ہی نہیں، اقلیت کی زبان کو مٹانے، ان کی تہذیبی اقدار کی بیخ کنی کرنے، ان کے ملّی تشخص اور

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.org www.javedahmadghamidi.com

تہذیبی امتیازات کو اکثریت کے تہذیبی دھارے میں ضم کرنے کو وہ اپنا قومی اور ملکی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں دلتوں اور مسلمانوں اور امریکہ میں کالوں کے ساتھ ہونے والا امتیازی سلوک جمہوریت کی نظری مساوات کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔

اسلام کا تصوّرِ مساوات اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ وہ ایک متوازن تصوّرِ مساوات ہے، جس میں منافقت کا ادنیٰ شائبہ شامل نہیں ہے۔ اس تصوّرِ مساوات میں اس بات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ سارے انسان باعتبارِ پیدائش مساوی ہیں۔ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً

''اے لوگو، اپنے اس رب کی نافرمانی سے بچو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور پھر دونوں (کے اتّصال) سے بہت سے مرد اور عورت (بنا کر روئے زمین پر) پھیلا دیے۔'' (سورۂ نسآء ۴:۱)

ظاہر ہے کہ جب تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو پھر ان کے درمیان رنگ و نسل اور زبان اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز کرنے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ رنگ و نسل اور زبان کا اختلاف فروعی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ ان کا تعلق پیدائش سے نہیں بلکہ جغرافیائی حالات سے ہے۔ اسلام میں ہر شخص خواہ وہ سیاہ فام ہو یا سفید فام، عورت ہو یا مرد، عجمی ہو یا عربی، مالک ہو یا نوکر، یکساں عزت و احترام کا مستحق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اے لوگو، تم سب کا رب ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری نہیں ہے مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو۔''[۳۲]

اسی طرح حقوق اور سماجی حیثیت کے معاملے میں جنس کی بنیاد پر کوئی تفریق و امتیاز روا نہیں ہے۔ فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ.

''ان کے (یعنی عورتوں کے) لیے وہی حقوق ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں۔'' (بقرہ ۲:۲۲۸)

---

۲۹ الفاروق، علامہ شبلی نعمانیؒ، حصہ دوم ص ۴۸۶

۳۰ سیرت العمرین، ابن جوزیؒ، ص ۱۲۷، مزید دیکھیں، عمر فاروق اعظم محمد حسین ہیکل، مترجم، حبیب اشعر، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۵۹۰

۳۱ کتاب الخراج، قاضی ابویوسفؒ، ص ۷، مزید دیکھیں، سیرت العمرین، ص ۱۲۷

دوسری جگہ فرمایا ہے:

لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج بَعْضُكُمْ مِّنْ ط بَعْضٍ.
(سورۂ آل عمران: ۱۹۵)

''میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کروں گا، تم سب آپس میں ایک ہو (یعنی ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہو)۔''

کنیزوں سے نکاح کے ذکر میں فرمایا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ط وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ م بَعْضٍ .
(سورۂ نسآء: ۲۵)

''اور تم میں سے جس کو یہ مقدرت حاصل نہ ہو کہ وہ آزاد مومنہ عورت سے نکاح کر سکے تو وہ ان مومنہ لونڈیوں سے جو تم لوگوں کی مملوکہ ہوں، نکاح کر لے، اللہ کو تمہارے ایمان کی خوب خبر ہے، تم سب آپس میں ایک ہو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسانی مساوات کی یہ اعلیٰ تعلیم محض کوئی نظری معاملہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا وہ مساوات کی مذکورہ بالا تعلیم پر مبنی تھا۔ اس میں پیدائشی اعتبار سے کوئی پست و بلند نہیں تھا۔ امیر و غریب اور آقا و غلام سب آپس میں بھائی تھے۔ سب کو دنیوی اور دینی ترقی کے یکساں مواقع حاصل تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو لشکر شام کی طرف بھیجا گیا اس کے کمانڈر ایک نوعمر صحابی اسامہ بن زید تھے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے فرزند۔ اس لشکر کی روانگی کا حال ایک اسلامی مؤرّخ کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''حضرت اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور جانشینِ رسول (خلیفہ) پیادہ پا گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف لگام تھامے ہوئے تھے۔ اسامہ نے کہا، اے جانشینِ رسول! آپ بھی سوار ہو لیں، ورنہ مجھے اترنے کی اجازت دیں۔ فرمایا، نہ میں خود سوار ہوں گا اور نہ تم کو اترنے کی اجازت دوں گا۔ یہ تعلیم اس بنا پر تھی کہ کوئی نوعمروں اور غلام زادوں کو حقیر نہ سمجھے[۳۲]۔''

حضرت عمر کے سفر شام کا حال بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ ''حضرت علی کو مدینہ کی خلافت

[۳۲] بیہقی

دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے۔ یُرفا ان کا غلام اور بہت سے صحابہ ساتھ تھے۔ ایلہ کے قریب پہنچے تو کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی اور خود اس کے اونٹ پر سوار ہوئے۔ راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے، پوچھتے تھے کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرماتے کہ ''تمھارے آگے۔''[۳۴]

مساوات کی اسلامی تعلیم پر اس وقت بھی عمل کیا گیا جب اسلامی معاشرے میں بہت سی خرابیاں آ گئی تھیں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ عہدِ عباسی کے نامور خلفاء مامون الرشید (۸۱۳-۸۳۳) اور معتصم (۸۳۳-۸۴۲) لونڈیوں کے بطن سے تھے۔[۳۵] مصر و شام میں ۱۲۵۰ سے ۱۳۸۲ تک جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ غلام یعنی مملوک تھے۔[۳۶]

ہندوستان میں پہلی اسلامی حکومت قائم کرنے والا قطب الدین ایبک (۱۲۰۶-۱۲۱۰) سلطان شہاب الدین غوری (۱۲۰۲-۱۲۰۶) کا غلام تھا۔ قطب الدین کے بعد جو لوگ تختِ حکومت پر بیٹھے وہ سب غلام تھے۔ یہ دور جو تقریباً ایک سو سال پر محیط ہے، تاریخ میں عہدِ غلاماں (The Slave Period) کے نام سے مشہور ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسلام کے تصورِ مساوات میں تیسری چیز جو نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ قانونی مساوات ہے، یعنی سارے لوگ خواہ ان کا تعلق سماج کے کسی طبقہ سے ہو، قانون کی نظر میں مساوی ہیں۔ اور اس کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بکثرت ہیں۔ ایک بار قبیلۂ قریش کی ایک عورت فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو مسلمانوں نے اسامہ بن زید کے توسّط سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرائی کہ عورت کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ آپ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیده لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدها.[۳۷]	''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

خلیفۂ دوم کے عہد کا واقعہ ہے کہ مصر کے گورنر عمرو بن العاص کے صاحب زادے محمد بن عمرو نے ایک قبطی مصری کو محض اس بنا پر تازیانے مارے کہ گھوڑ دوڑ میں اس کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا۔ خلیفہ کو جب اس زیادتی کی خبر ملی تو باپ اور بیٹے دونوں کو مدینہ طلب کیا اور مصری کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا: ''مار شریفوں[۳۸] کے بیٹے کو۔'' صاحب زادے کی پٹائی کے بعد فرمایا ''عمرو بن العاص کی چندیاں پر بھی درّے لگا، کیوں کہ خدا کی قسم اس نے اس کی حکومت ہی کے بل پر تجھے مارا ہے۔'' مگر مصری نے کہا کہ امیر المومنین، جس نے مجھے مارا تھا میں نے اس سے بدلہ لے لیا اور میرا

۳۴؎ تاریخ اسلام، مولانا ابوالمکارم فضل الوہاب، کلکتہ ۱۹۳۶ (طبع پنجم)، حصّہ دوم، ص ۱۸، ۱۹، مزید دیکھیں، سیرت حضرت ابوبکر، محمد حسین ہیکل

کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔[39]‘‘ اس موقع پر خلیفہ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

منذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً.[40]	’’تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے حالاں کہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا۔‘‘

حضرت عمر ہی کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے کہ جبلہ بن الایہم غسانی نے ایک بدّو کو تھپڑ مار دیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا اور معاملہ خلیفہ تک پہنچا۔ انھوں نے بدّو کے بدلے کو درست قرار دیا۔ اس فیصلے پر غسّانی نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا ’’امیر المومنین، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی ہے اور میں اپنے علاقے کا بادشاہ ہوں۔ خلیفہ نے فرمایا ’’اسلام نے دونوں کو بھائی بنا دیا ہے، اب تم صرف تقویٰ کے ذریعہ سے اس پر فضیلت حاصل کر سکتے ہو، کسی اور صورت میں نہیں[41]‘‘۔

علامہ شبلی نعمانی نے ’’کنزل العمال‘‘ کے حوالے سے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

’’جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس بلکہ بادشاہ تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ کعبے کے طواف میں اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ غصّے سے بے تاب ہو گیا اور حضرت عمر کے پاس آیا۔ حضرت عمر نے اس کی شکایت سن کر کہا، تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی۔ اس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا، جاہلیت میں ایسا ہی تھا۔ لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و ذلیل کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آتا ہوں۔ غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا۔[42]‘‘

خود خلیفۂ دوم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن بن عمر پر شراب نوشی کے جرم میں حد جاری کر کے حاکم اور رعایا کے درمیان قانونی مساوات کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔[43] جمہوریت کے علم بردار قانون کی نظر میں مساوات (equality before the law) کا بہت چرچا کرتے ہیں، لیکن کیا وہ

۳۴؎ الفاروق، حصہ اوّل، ص ۱۶۴

۳۵؎ ملّت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۴، حصّہ اوّل، ص ۲۱۹

۳۶؎ ایضاً، ص ۷۹

امام ابن تیمیہؒ (م ۱۳۲۸ء) جیسی عظیم المرتبت علمی و دینی شخصیت کا تعلق عہدِ مملوک ہی سے تھا۔

۳۷؎ صحیح مسلم، باب: قطع السارق الشریف، مزید دیکھیں، صحیح بخاری، کتاب الحدود، عن عائشہؓ،

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کوئی ایسا واقعہ پیش کر سکتے ہیں کہ کسی جمہوری ملک کے فرماں روا نے اپنے اہلِ خاندان کو ان کے کسی جرم پر خود اپنے ہاتھوں سزا دی ہو یا پیش قدمی کر کے عدالت سے سزا دلوائی ہو؟

ابھی تک جمہوریت کی نظری خامیوں سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بالمقابل اسلامی نظام حکومت کے نظری اور عملی پہلوؤں کو پیش کر کے دکھایا گیا ہے کہ اس کے اصول اور قاعدے زیادہ عمدہ اور عدل پر مبنی ہیں۔ اب آگے جمہوریت کے عملی نقائص پر گفتگو ہو گی اور اس کے بعد اسلام کے شورائی نظام کے عملی طریقوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

عملی اعتبار سے جمہوریت کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں حکومت کی تشکیل براہِ راست عوام کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جن ملکوں بالخصوص ایشیاء اور افریقہ کے عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے، ان سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ سیاسی بیداری کا ثبوت دیں گے اور ان ہی افراد کو منتخب کریں گے جو سیاسی فہم اور قانون سازی کی صلاحیت رکھتے ہوں، نادانی کی بات ہو گی۔ اور یہ بات ان ملکوں کے جمہوری تجربوں سے بالکل واضح ہے۔

دوسرا عملی نقص یہ ہے کہ عوام انتخاب کے ذریعے اپنے جو نمایندے چنتے ہیں ان کے لیے کسی طرح کی علمی قابلیت اور سیرت کی خوبی لازمی نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ وہ بالکل ناخواندہ ہو، عوام کا نمایندہ بن سکتا ہے، حتّٰی کہ خراب سیرت کے لوگ بھی اکثر اوقات مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہو جاتے ہیں۔

یہ طرفہ تماشا نہیں تو کیا ہے کہ حکومت کے مختلف مناصب پر تقرّر کے لیے ایک خاص لیاقت ضروری ہے، اس کے بغیر کسی عہدہ کا حصول ناممکن ہے۔ لیکن سیاست ایک ایسا شعبہ ہے جس کے لیے کوئی لیاقت مطلوب نہیں ہے، حالاں کہ یہ شعبہ حکومت کے دوسرے تمام شعبوں کے لیے مثل دماغ کے ہے۔ اگر اس شعبہ میں صاحبِ علم افراد نہ ہوں تو حکومت کے دوسرے شعبوں کی کارکردگی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو مجلسِ آئین ساز کی شکل میں قوانین وضع کرتا ہے اور مجلسِ عاملہ کی شکل میں ان کو نافذ کرتا ہے۔ کام کی یہ نوعیت خود بتاتی ہے کہ اس شعبہ میں کس قسم کے افراد کی ضرورت ہے۔ ماہرینِ علمِ سیاست کا یہ متّفقہ خیال ہے کہ کوئی جمہوری حکومت صرف اسی صورت

۳۸؎ عمرو بن العاص کے بیٹے نے قبطی کو تازیانے مارتے ہوئے کہا تھا ''لے یہ کوڑے، میں شریفوں کا بیٹا ہوں۔''

۳۹؎ عمر بن الخطاب، علامہ طنطاوی، مترجم عبدالصمد صارم، مطبوعہ البیان لاہور، ۱۹۷۱، ص ۱۸۷

۴۰؎ ایضاً، مزید دیکھیں، الفاروق، حصّہ دوم، ص ۴۰۹، ۴۱۰، عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، ص ۵۹۵

۴۱؎ عمر بن الخطاب، علامہ طنطاوی، ص ۲۵۴، مزید دیکھیں، کتاب الاموال، ابوعبید، ص ۳۰

۴۲؎ الفاروق، حصہ دوم، ص ۳۷۵

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے جب اسے دور اندیش اور بیدار مغز قیادت میسّر ہو۔

جمہوریت کے مذکورہ نقص ہی کی وجہ سے افلاطون (۴۲۸۔۳۴۸ ق م) نے اپنی کتاب ریاست (The Republic) میں لکھا ہے:

''جمہوریت محض نراج کا نام ہے، اس میں بناوٹ اور تصنّع کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے شہری خود غرضی اور مکّاری میں ایسے ڈوبے ہوتے ہیں کہ کوئی کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ شہریوں میں فرقہ بندیاں نمودار ہوتی ہیں اور ہر فرقہ کا کوئی ایسا مکّار اور چال باز آدمی سردار بن جاتا ہے جسے اپنے اقتدار کے علاوہ کسی اور بات کی فکر نہیں ہوتی۔ آخر میں ایک وقت آتا ہے جب انھی فرقوں کے سرداروں میں سے ایک شہر کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھتا ہے۔ اس شخص کی ہوس اور شہرت کی بے لگامی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے، دیکھنے میں وہ دوسروں کا بادشاہ، لیکن دراصل اپنی خواہشوں کا بے بس غلام ہوتا ہے، اور کوئی ایسی کمینی اور ظالمانہ حرکت نہیں ہوتی جو اس سے سرزد نہ ہو، اس لیے کہ اس کا دل عقل کی روشنی اور اخلاق کی رہبری سے محروم ہوتا ہے۔''[۴۴]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جمہوریت کا تیسرا عملی نقص اس کا جماعتی طریقۂ انتخاب ہے۔ اس قاعدے کے مطابق وہی لوگ بحیثیت امیدوار کھڑے ہوتے ہیں جن کو کوئی سیاسی جماعت اپنا امیدوار بناتی ہے۔ اور جماعت ان ہی لوگوں کو اپنا امیدوار بناتی ہے جو جماعت کے قائد کے فرماں بردار ہوتے ہیں یا کسی ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مفادات کی یہ جماعت نگراں اور محافظ ہوتی ہے۔ اس طرح ہر سیاسی جماعت ملک وقوم کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کے بجائے جماعتی یا شخصی مفادات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ملکی سیاست میں جماعتی اور شخصی مفادات کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہے کہ سماج کے بہت سے افراد علم و تجربہ اور کردار کی خوبیاں رکھنے کے باوجود محض سرمایہ کی قلّت اور کسی سیاسی جماعت یا بڑی سیاسی شخصیت سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکی سیاست سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ملک باصلاحیت اور صاحبِ کردار افراد سے محروم ہو جاتا ہے اور ملک کی زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جو نااہل ہی نہیں ہوتے بلکہ پرلے درجے کے خود غرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ اور بالآخر ایسے بدقماش لوگوں کے ہاتھوں ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کا چوتھا عملی نقص یہ ہے کہ اس میں انتخاب کا عمل مسرفانہ ہے۔ اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ ملک کی

۴۴؎ تفصیل کے لیے دیکھیں، عمر فاروق اعظم، محمد حسین ہیکل، ص ۵۹۴، ۵۹۵

دولت ضائع ہوتی ہے اور دوسرا نقصان جو زیادہ بڑا ہے، یہ ہے کہ انتخاب میں وہی لوگ حصّہ لے سکتے ہیں جو خود سرمایہ دار ہوں یا کسی سرمایہ دار یا سیاسی جماعت کی انھیں حمایت حاصل ہو۔ اس طرح دیکھیں تو در پردہ وہ لوگ حکومت چلاتے ہیں جو سرمایہ دار ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کو اپنے صنعتی اور تجارتی مفادات کے علاوہ کسی دوسری بات سے مطلق دلچسپی نہیں ہوتی۔

جمہوریت کے برخلاف اسلام کا شورائی نظام ان سب خرابیوں سے پاک ہے۔ اس میں حکومت کی تشکیل تو انتخاب ہی کے ذریعے سے ہوگی لیکن درج ذیل شرائط کی پابندی لازمی ہے۔

(۱) انتخاب میں وہی لوگ حصہ لینے کے مجاز ہیں جو اس کے اہل ہوں (سورۂ نسآء:۵۸)۔ حضرت ابوذر غفّاری سے روایت ہے کہ:

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے حکومت کے کسی عہدے پر مامور کیا جائے۔ آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا، ابوذر، یہ ایک بھاری امانت ہے اور تم ایک کم زور آدمی ہو۔ قیامت کے دن یہ امانت باعث رسوائی ہوگی، مگر اس کے لیے نہیں جو اس کو حق کے ساتھ اٹھائے اور اس کی ذمّہ داریوں کو کماحقّہ ادا کرے[۴۵]۔''

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اسی تعلیم کا اثر تھا کہ خلیفۂ دوم نے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد فرمایا:

''اگر میں جانتا کہ کوئی دوسرا مجھ سے زیادہ امورِ خلافت کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس صورت میں منصبِ خلافت کی ذمّہ داری قبول کرنے کے مقابلے میں میرا قتل کیا جانا میرے لیے زیادہ راحت کا باعث ہوتا[۴۶]۔''

قرآن میں اہلیت کا جو معیار مقرر کیا گیا ہے وہ ''علم و جسم[۴۷]'' اور تقویٰ ہے۔

(۲) کوئی شخص خود کسی عہدہ کا خواہش مند نہ ہو لیکن اگر کوئی ذمّہ داری اس کو دی جائے تو قبول کرلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

انا، واللّٰہ، لانولی علی ھذا العمل احداً سائلہ ولا احداً حرص علیہ[۴۸]۔	''خدا کی قسم، میں کسی ایسے آدمی کو انتظام حکومت میں کوئی عہدہ نہ دوں گا جو اس کا خواستگار ہو اور اس کی حرص رکھتا ہو۔''

عہدہ طلب نہ کرنے کی وجہ بھی آپ نے بتادی ہے۔ عبدالرحمٰن بن سمرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے مجھ سے فرمایا:

[۴۴] تاریخ فلسفۂ سیاسیات، محمد مجیب، ص ۳۱

یا عبد الرحمن، لا تسأل الامارة، فانك ان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیها و ان اعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیها۔[49]	''اے عبدالرحمٰن، امارت طلب نہ کرو، کیوں کہ اگر وہ تمھیں طلب کرنے پر ملی تو تمھیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور اگر بغیر مانگے مل گئی تو اللہ کی طرف سے اس کام میں تمہاری مدد کی جائے گی۔''

اس سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی قابلِ ذکر ہے جس میں امارت سے متعلق ایک استفسار کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے ابوبکر وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بے رغبت ہو، نہ کہ اس کے لیے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو، وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے، نہ کہ اس کے لیے جو اس پر جھپٹے، وہ اس کے لیے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے، نہ کہ اس کے لیے جو خود کہے کہ یہ میرا حق ہے۔[50]''

عہدہ ومنزلت کی طلب ایک فطری خواہش ہے اور اس سے وہی لوگ بے نیازی اختیار کر سکتے ہیں جن کے نفس پاکیزہ یعنی تقویٰ کے حامل ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے جب حضرت عمر کو خلیفہ نامزد کیا تو ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

> ''عمر پہلی چیز جس کی طرف سے میں تمھیں ہوشیار رہنے کی نصیحت کرتا ہوں وہ خود تمہارا نفس ہے۔ ہر نفس کی کچھ خواہش ہوتی ہے اور جب تم اس کی کوئی خواہش پوری کر دو گے تو وہ آگے بڑھ کر دوسری خواہش کے لیے مچلنے لگے گا۔ اور دیکھو اصحابِ رسول میں سے اس گروہ سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ پھول گئے ہیں، نگاہوں میں ہوس بس گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کو اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے...... اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے، جب تک تمہاری روش درست رہے گی، یہ لوگ بھی تمہارے لیے سیدھے رہیں گے۔[51]''

(۳) انتخاب غیر جماعتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست جسدِ واحد کی طرح ہے، اس لیے سیاسی اور مذہبی یا کسی اور بنیاد پر جماعت سازی کا مطلب اس کی ہیئتِ اجتماعی کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں فرقہ بندی ممنوع ہے، خواہ یہ سیاسی ہو یا مذہبی۔ فرمایا ہے:

---

۴۵ صحیح مسلم، باب کراہۃ الامارۃ

۴۶ عمر بن الخطاب، طنطاوی، ص ۷۰

۴۷ علم وجسم (سورۂ بقرہ: ۲۴۷) سے مراد یہ ہے کہ قاید بدنی لحاظ سے توانا اور جری اور دماغی اعتبار سے قوی ہو یعنی معاملہ فہم اور دور اندیش۔ تقویٰ کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن اس کا کم سے کم مفہوم یہ ہے کہ وہ دیانت دار اور جاہ ومال سے بے نیاز ہو۔ افلاطون نے محافظینِ ریاست کے لیے چار صفتوں کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، علم، شجاعت، عفّت اور عدل (دیکھیں، ریاست (ریپبلک)، مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین، انجمن ترقی اردو دکن، ۱۹۳۲، ص ۲۲۶ تا ۲۴۱)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَلَا تَکُوْنُوا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلفُوا. (ال عمران:۱۰۵)

’’(اے مسلمانو!) ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے باہم تفرقہ اور اختلاف کیا۔‘‘

اسلامی نظام حکومت میں مجلسِ شوریٰ ہی کو حزبِ اختلاف کی حیثیت حاصل ہے، اس کو پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ غیر جانبدارانہ طور پر حکومت پر تنقید اور اس کا محاسبہ کرے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے ارکان کا انتخاب غیر جماعتی بنیاد پر ہو۔

(۴) امیر ریاست (صدر مملکت[۵۲]) کا انتخاب براہِ راست عوام کے بجائے اہل الرّائے کے ذریعے سے ہو اور یہ اہل الرّائے مجلس شوریٰ کے منتخب ارکان ہوں گے۔ ماضی میں اس کی کئی نظیریں موجود ہیں۔ خلیفۂ اوّل کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے مشورہ سے ہوا، یہ لوگ اپنی قوم کے اہل الرّائے تھے اور سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت مجلسِ شوریٰ کی تھی۔ اگرچہ خلیفۂ دوم کو نامزد کیا گیا تھا لیکن بعد میں بیعت عام کے ذریعہ جس میں مدینہ کے اہلِ الرائے شریک تھے، اس نامزدگی کی توثیق ہوئی۔ خلیفۂ سوم کی شہادت کے بعد بدقسمتی سے انتخابِ امیر کا طریقہ موقوف ہو گیا اور ملوکیت کا دور شروع ہوا۔

اس میں استثنائی حیثیت اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ (۷۱۷-۷۲۰) کی ہے۔ انھوں نے دوبارہ شورائی طریقۂ انتخاب کو اختیار کیا۔ سلیمان بن عبدالملک (۷۱۵-۷۱۷) نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن وہ اس تقرر سے راضی نہیں ہوئے اور اعلان فرمایا:

ایّھا الناس، انّی ابتلیت بھذا الامر من غیر رائی منّی ولا طلبة ولا مشورة من المسلمین، وانی قد خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی فاختاروا لانفسکم غیری۔[۵۳]

’’لوگو! مجھے میری رائے اور خواہش، نیز مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر حاکم بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے میں تمھیں اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔ اب تم میرے سوا جس کو چاہو اپنا امیر بنا لو۔‘‘

۴۸؎ صحیح مسلم و بخاری، مزید دیکھیں، ابوداؤد

۴۹؎ صحیح مسلم

۵۰؎ صبح الاعشیٰ، قَلقَشندی، بحوالہ، اسلامی ریاست، مولانا مودودیؒ، لاہور ۱۹۶۷، ص ۳۷۷ (مولانا نے تصریح کر دی ہے کہ یہ اثر حدیث کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے)۔

۵۱؎ کتاب الخراج، امام ابو یوسفؒ، مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مکتبہ چراغ راہ کراچی، ص ۱۲۶

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

چنانچہ اس وقت جو لوگ مسلمانوں کے اہل الرّ ائے تھے انھوں نے اپنی خوشی سے عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا۔ یہ اہل الرّ ائے دراصل اہلِ استنباط ہیں جن کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰۤى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ. (سورۂ نساء:۸۳)

''اگر وہ اس خبر کو رسول اور اپنے اولو الامر تک پہنچا دیتے تو ان میں جو اہلِ استنباط ہیں وہ (اس خبر کی اصلیت کو بآسانی) جان لیتے۔''

اس آیت سے اسلامی نظام حکومت میں اہل الرّ ائے کا مقام اور ان کا کارِ منصبی بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ حکومت سازی میں اہلِ استنباط کی رائے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ عوام کا کام یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا نمایندہ بنائیں جو ان کے درمیان اپنی معاملہ فہمی اور حسنِ سیرت کے لحاظ سے ممتاز ہوں۔ اور پھر یہ اختیارِ امّت اسلامی ریاست کے امیر کو منتخب کریں۔ یہی طریقہ مطابقِ عقل ہے اور تجربے اور مشاہدے سے بھی اس کی افادیت ثابت ہو چکی ہے۔[۵۴]

(۵) اہل الرّ ائے اور امیر دونوں کا انتخاب سادگی سے ہو۔ ہر امیدوار کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب میں اپنا تعارف کرائے اور بتائے کہ اگر وہ منتخب ہو گیا تو عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کام کرے گا۔ اس مقصد کے لیے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے موجودہ ذرائع کا استعمال پہلے سے مقررہ ضوابط کے مطابق کیا جائے اور اس کا خرچ اسلامی ریاست برداشت کرے۔ آج کل جمہوری ملکوں میں الیکشن کے موقع پر جس طرح تعارف و تشہیر (campaigning) کے نام پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اور مسرفانہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ سب ممنوع ہوں۔ کسی امیدوار کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ خود کو منتخب کرانے کے لیے اپنی دولت کا بے جا استعمال کرے اور جدید تشہیری وسائل کے ذریعہ سے شور و ہنگامہ کر کے عام لوگوں کے امن و سکون اور کاروباری مشاغل میں خلل انداز ہو۔ جس طرح شخصی تعارف سیدھا اور براہ راست ہوتا ہے اسی طرح انتخابی تعارف بھی سیدھا اور آسان ہونا چاہیے، جیسا کہ اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا. (سورۂ احزاب:۷۰)

''اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو (یعنی داؤں پیچ سے کام نہ لو)۔''

گزشتہ صفحات میں جمہوریت اور اسلام کے نظامِ حکومت کا جو تقابلی تعارف پیش کیا گیا ہے اس سے بالکل واضح

۵۴؎ راقم کے خیال میں صدارتی نظام (presidential system) ہی مناسب ہے، یہ نظام مسلمانوں کے مزاج اور ان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ سے مطابقت رکھتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہوگیا کہ ان نظامات میں نہ صرف اصولی اختلاف ہے بلکہ ان کے لائحۂ عمل بھی مختلف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمدّنی مسائل کا حل نہ جمہوریت میں ہے اور نہ ہی کسی اور سیاسی نظام میں، ان کا حل صرف اسلام کے شورائی نظام میں ہے جو خدا کے قانون (قرآن) اور مسلمانوں کے اہل الرّائے کے مشورہ پر مبنی ہے۔ قانونِ خداوندی اور مشاورت سے انحراف کا دوسرا نام آمریت اور استبدادی حکومت ہے۔ چوں کہ غیر مسلموں کے پاس جمہوریت کا کوئی موزوں متبادل نہیں ہے اس لیے جمہوری نظام ان کے لیے مفید ہے، لیکن مسلمانوں کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کے پاس اسلام کا شورائی نظام موجود ہے جو جمہوریت سے بدرجہا فائق ہے۔ وہ ان نقائص سے جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا گیا، بالکل خالی ہے جو جمہوری نظام میں پائے جاتے ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۵۳؎ اسلامی نظریۂ سیاست، مولانا حیدرزماں صدیقی، ص ۳۰

۵۴؎ انتخابِ امیر کا معاملہ تمام تر لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی حالت کے تابع ہے۔ اگر ایک طویل عرصہ کے بعد محسوس ہو کہ اسلامی ریاست کے زیادہ تر شہری تعلیم یافتہ اور سیرت واخلاق کے لحاظ سے خوب تر ہو چکے ہیں تو امیر کا انتخاب براہِ راست عوام کے ذریعے سے ہوسکتا ہے۔